دل کا سارا انتظام اللہ نے جانے کیوں پردے میں رکھا ہے۔ چاہے جسمانی ہو یا احساسات کا معاملہ... اس کا دل بھی بہت اچھا تھا لیکن سرخ آنکھوں میں ایک دکھ کا احساس جھلکتا تھا۔ یہ انسان بھی کیا چیز ہے۔ کئی پردوں میں چھپا ہوا... دل میں درد کی لہریں اور ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے پہرے... عجب تماشا ہے زندگی بھی...

گم شدہ محبت کے ملال میں مبتلا

ایک حسینہ کا ماجرا

میں شروع سے ہی بہت نازک مزاج تھی، اس کے علاوہ جسمانی طور پر بھی بہت زیادہ حساس تھی، ذرا سردی یا گرمی لگی اور بیماری نے آن دبوچا۔ نزلہ زکام اور بخار جیسی وبائی تکلیفیں بھی مجھے بڑی جلدی آ پکڑ لیتی تھیں۔ ایسے دنوں میں اکثر امی چند دن کے لیے مجھے اسکول سے چھٹی کرا لیتی تھیں۔

میں چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے لاڈلی بھی زیادہ تھی۔ سارے کہتے تھے کہ میں بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ پیاری ہوں۔ شاید اس وجہ

سے سب مجھ پر توجہ اور دھیان بھی دیتے تھے جس کی وجہ سے میں اکثر بیمار ہو جاتی تھی۔ ادھر کسی کو چھینک آئی ادھر میں نے بھی چھینکنا شروع کر دیا۔ موسمی بخار کے دن آئے تو سب سے پہلے میرے منہ میں تھرمامیٹر آیا۔ آشوب چشم شروع ہوا تو سب سے پہلے میری آنکھوں میں لالی اتری۔ بڑی چاچی میرے لیے پنجابی کا ایک محاورہ استعمال کرتی تھیں...... جس کے معنی کچھ یوں تھے...... جس گڑ کی بہت ضرورت ہوتی ہے وہ عموماً ڈھیلا اور خراب ہی ملتا ہے۔

میرے ابو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں آفیسر تھے۔ معقول تنخواہ تھی۔ اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ میرے دو چچا بھی تھے جو ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ لاہور کی ایک جانب کشادہ رہائشی آبادی میں یہ دو منزلہ مکان تھا۔ یہ تیس چالیس سال پہلے ہمارے دادا نے بنوایا تھا۔ دادا تو اب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، دادی حیات تھیں اور ہم سب کے درمیان تھیں۔ بڑے چچا کی شادی ہو چکی تھی اور ان کے ماشاءاللہ تین بچے تھے۔ چھوٹے چچا جو بڑے چچا سے آٹھ دس سال چھوٹے تھے، حال ہی میں شادی شدہ ہوئے تھے۔ چھوٹی چچی کا نام سارہ تھا۔ وہ ایک انگلش اسکول میں ٹیچر رہی تھیں۔ کافی اسمارٹ اور دلکش تھیں۔ مجھے ان کے لمبے گھنے بال سب سے زیادہ اچھے لگتے تھے۔ ان دنوں میری عمر سات آٹھ سال رہی ہوگی۔

چھوٹی چچی سارہ بڑے اچھے طور اطوار کی مالک تھیں۔ ہر ایک کے لیے دل میں ہمدردی اور محبت رکھتی تھیں۔ مجھے ان کے پاس بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا لیکن چھوٹی چچی کے ساتھ ایک چھوٹا سا مسئلہ بھی تھا۔ میں نے اسے ''چھوٹا'' کہا ہے لیکن میرے لیے شاید یہ چھوٹا نہیں تھا۔ چھوٹی چچی کو اکثر الرجی رہتی تھی۔ ناک سرخ رہتی، کبھی کبھی آنکھوں سے پانی بھی نکلتا اور وہ ہاتھ میں رومال یا ٹشو پیپر پکڑے نظر آتیں۔ سردی شروع ہوئی تو انہیں کئی دفعہ چھینکیں مارتے بھی دیکھا۔

امی، ابو اور خاص طور سے امی کو وہم کی حد تک میری صحت کی فکر لاحق رہتی تھی۔ امی نے ایک دن بڑی خاموشی سے مجھے کہہ دیا کہ میں چچی سارہ کے ساتھ زیادہ میل جول نہ رکھوں۔

ایسے معاملوں میں، میں خود بھی بہت حساس ہو چکی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود میں چچی سارہ سے قدرے دور رہنے لگی۔ خاص طور سے جن دنوں ان کی ناک سرخ نظر آتی یا آنکھیں سوجی سوجی ہوتیں...... یا وہ ویسے ہی پژمردہ دکھائی دے رہی ہوتیں۔ چچی سارہ دادا کے ایک دوست کی پوتی تھیں۔ یہ لوگ اسلام آباد میں رہتے تھے۔ چچی سارہ کی الرجی کو بھی اسلام آباد کے موسم سے ہی نتھی کیا جاتا تھا۔ وہاں ہوا میں غالباً کسی طرح کا ''پولن'' تھا جو شہر کے اکثر مکینوں کو اس مصیبت میں مبتلا کیے رکھتا تھا۔

جو کچھ بھی تھا لیکن چچی سارہ مجھے اچھی لگتی تھیں۔ کسی وقت میں اسکول سے ملنے والا ہوم ورک لے کر ان کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ اتنے اچھے طریقے سے ہوم ورک کراتیں کہ میں حیران رہ جاتی۔ پھر ان کی دلچسپ باتیں، ان کا پیار بھرا انداز اور ان کے گز بھر لمبے ریشمی بال جو حرکت کرتے ہوئے بار بار ان کے دودھیا چہرے پر آجاتے تھے اور جنہیں وہ اپنی خوب صورت انگلیوں سے پیچھے ہٹاتی تھیں لیکن اس قسم کے موقعے کم ہی آتے تھے۔ خاص طور سے جب امی گھر میں موجود ہوتیں، میں اس طرح کا رسک ہرگز نہیں لیتی تھی۔ امی اور چچی سارہ کے درمیان دیورانی، جیٹھانی کا رشتہ تھا اور اس رشتے میں اکثر شکایتیں اور تلخیاں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ تاہم اس معاملے میں بھی چچی سارہ کا جھکاؤ اکثر مفاہمت اور صلح کی طرف ہی ہوتا تھا۔ چچا، چچی کے آپس کے تعلقات بھی ٹھیک ہی تھے۔ دونوں مہینے میں ایک بار لاہور سے اسلام آباد جاتے اور واپسی پر ہم سب بچوں کے لیے ہماری پسندیدہ چاکلیٹس، کھلونے اور کپڑے وغیرہ لاتے۔ مجھے یقین ہے میرے اور چچی کے درمیان خوب جمتی اگر ہمارے درمیان یہ الرجی والا معاملہ نہ آجاتا۔

اب اتنے برسوں کے بعد میں سوچتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں ہم بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ برائے نام مسائل کو بڑے بڑے وسوسوں اور واہموں کا روپ دے دیتے ہیں۔ چچی سارہ کے حوالے سے میرے ذہن میں جو گریز پیدا ہوا تھا وہ دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔ میں ان سے کچھی کچھی رہنے لگی۔ دلی خواہش ہونے کے باوجود میں ان کے پاس زیادہ نہ بیٹھتی اور نہ ہی ان کے کمرے میں جاتی۔ بچپن کی ایک بات مجھے آج تک یاد ہے۔ ایک دن چچی سارہ نم آنکھوں اور سرخی مائل ناک کے ساتھ کمرے سے نکلیں اور چھت پر چلی گئیں۔ بڑے چچا نے بڑی چچی نبیلہ سے کہا۔ ''لگتا ہے، سارہ کو پھر الرجی کا اٹیک ہوا ہے۔''

بڑی چچی نبیلہ نے برا سا منہ بنا کر کہا تھا۔ ''کوئی الرجی ورجی نہیں ہے، بس ڈرامے کرتی ہے...... کچن سے دور رہنا کس کو اچھا نہیں لگتا۔''

اس بارے میں بڑے چچا اور بڑی چچی میں کچھ اور

باتیں بھی ہوئی ہوں گی لیکن میرے کانوں تک نہیں پہنچیں۔
بس چچی نبیلہ کا ایک اڑتا اڑتا سا طنزیہ جملہ میری سماعت سے ضرور ٹکرایا۔ ”یہ الرجی سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے۔“
یقیناً یہ جملہ چچی سارہ کے لیے ہی تھا، میں کئی دن تک الجھن میں مبتلا رہی، پھر یہ بات خود بخود ذہن سے نکل گئی۔
ایک دن چچی سارہ اچھے موڈ میں نظر آئیں۔ ان کا چہرہ بھی نارمل ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ساتویں کلاس کے پیپرز تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ چچی چھت پر بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ میں اپنی میتھ کی بک لے کر ان کے پاس جا بیٹھی۔ ان سے دو چار سوالوں کے حل میں مدد لی پھر انگلش گرامر کے دو تین سوال ان سے پوچھے۔ چچی محبت سے میرے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہیں اور ساتھ ساتھ مجھے پڑھاتی رہیں پھر ایک دم کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے بولیں۔ ”نادو! کیا بات ہے۔ تم دور دور رہتی ہو مجھ سے۔ پچھلے ہفتے میرے سر میں اتنا درد رہا، تم نے حال تک نہیں پوچھا؟“
میں کوئی بہانہ بنانا چاہتی تھی لیکن پھر پتا نہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے چچی کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سچی سچی بتاؤں، آپ برا تو نہیں مانیں گی؟“
”وعدہ...... بالکل نہیں مانوں گی۔“ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تھا۔
”آپ کو پتا ہی ہے، مجھے بڑی جلدی نزلہ زکام ہو جاتا ہے۔ امی میرے لیے ہر وقت ڈری ہوئی رہتی ہیں۔ آپ کو اکثر الرجی رہتی ہے۔ اس لیے میں ذرا دور رہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن یقین کریں امی کے بعد پورے گھر میں مجھے سب سے زیادہ آپ اچھی لگتی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بیٹھی رہوں، آپ سے باتیں کرتی رہوں۔“
انہوں نے ایک گہری سانس لی اور میرے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔ ”تو پھر بیٹھی رہا کرو، باتیں کرتی رہا کرو۔ تمہیں گارنٹی دیتی ہوں کہ میری الرجی تمہیں نہیں لگے گی۔ بیماری کے جراثیموں سے پیار کے جراثیم زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے جراثیموں کو مار دیتے ہیں۔“
میں مسکرا دی۔ وہ خود بھی ہنسنے لگیں۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا۔ شفقت سے میرا ماتھا چوما اور میری ناک سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے بولیں۔ ”مجھے الرجی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“
اسی دوران میں امی اوپر آ گئی تھیں۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ چھوٹی چچی نے مجھے گلے سے لگا رکھا ہے۔ ان کے

کترنیں

☆ روپے کی قیمت کتنی بھی گر جائے لیکن اتنی کبھی نہیں گر سکتی جتنا روپے کے لیے انسان گر جاتا ہے۔

☆ شیشے کو توڑنے کے لیے ایک پتھر کافی ہوتا ہے۔

☆ دل کو توڑنے کے لیے ایک لفظ کافی ہوتا ہے۔

☆ محبت میں گزارنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔

☆ زندگی گزارنے کے لیے ایک اچھا دوست کافی ہوتا ہے۔

☆ زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے بلکہ زندگی کا اصل المیہ یہ ہے کہ ہم جینا بہت دیر بعد سیکھتے ہیں۔

☆ ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔

☆ اگر کسی اچھے انسان سے غلطی ہو جائے تو درگزر کرنا چاہیے کیونکہ موتی اگر کیچڑ میں بھی گر جائے تو بھی قیمتی ہی رہتا ہے۔

☆ برا وقت وہ شفاف آئینہ ہے جو بہت سارے چہرے واضح کر دیتا ہے اور اچھا وقت بادلوں کی طرح ہے جو سورج کی تپش کو بھی روک لیتا ہے۔

☆ خالی پیٹ، خالی جیب اور جھوٹا دوست انسان کو وہ سبق سکھاتا ہے جو بڑے سے بڑا استاد بھی نہیں سکھا سکتا۔

☆ اپنا فائدہ سوچے بنا سب کے ساتھ اچھا کرو کیونکہ جو لوگ پھول تقسیم کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریزدی
اورنگی ٹاؤن، کراچی

چہرے پر شدید ناگواری کا رنگ بکھر گیا۔ پہلے تو اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر ان سے رہا نہیں گیا۔ مجھے ڈانٹتے ہوئے بولیں۔ ''دو چار دن ہوگئے ہیں نا ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے۔ اب پھر بیمار ہو کر بیٹھ جانا۔ اوپر سے امتحان سر پر ہیں۔ فیل بھی ہوجاؤ گی انشاءاللہ۔'' وہ پاؤں پٹختی ہوئی نیچے اتر گئیں۔ چچی کا رنگ فق ہوگیا۔ میں بھی امی اور چچی کی لڑائی کے خیال سے سہم گئی اور جلدی سے کتابیں سمیٹ کر نیچے اتر آئی۔

اس واقعے کے بعد چچی سارہ سے میرا ملنا جلنا مزید کم ہوگیا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے ابو اور دونوں چچاؤں میں اختلافات بڑھ گئے۔ ایک ساتھ رہنا مشکل ہوگیا۔ چھوٹے چچا نے لاہور ہی میں ایک علیٰحدہ گھر لے لیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد چچی سارہ سے میرا ملنا جلنا نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ بس کبھی کبھار فون پر بات ہوجاتی یا پھر فیملی کے کسی فنکشن میں ملاقات ہوجاتی تھی۔ ویسے بھی مجھ پر پڑھائی کا بوجھ بتدریج بڑھ گیا تھا۔ میٹرک کے امتحان قریب آتے جارہے تھے اور ابو دن رات مجھے محنت کرا رہے تھے۔ ابو نہ ہوتے تو بڑے بھائی جان مجھے لے کر بیٹھ جاتے اور میں رات گئے تک کتابوں میں غرق رہتی۔ گھر والے مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ میری بھی خواہش تھی کہ ڈاکٹر بنوں اور اگر بن جاؤں تو پھر الرجی ودمہ وغیرہ کی فیلڈ میں اسپیشلائزیشن کروں لیکن انسان کی ہر خواہش تو پوری نہیں ہوتی۔ بس تین چار نمبروں کے فرق سے مجھے پری میڈیکل میں داخلہ نہ مل سکا۔ دوسرا آپشن بی بی اے کا تھا۔ مجھے لاہور کے ایک بہترین کالج میں اسکالر شپ پر داخلہ مل گیا۔ میں نے بڑی جانفشانی سے اسٹڈی شروع کردی۔ میرا ہر نتیجہ بہترین رہا۔ کلاس میں اول پوزیشن جیسے میرے لیے مخصوص ہوکر رہ گئی تھی۔ اسی کالج میں میرا ایک فرسٹ کزن یاسر بھی پڑھ رہا تھا۔ وہ ''بی بی اے'' کے ففتھ سمسٹر میں تھا۔ ہم دونوں خالہ زاد تھے۔ میں نوعمری ہی میں یاسر سے وابستگی محسوس کرتی تھی۔ جب کالج میں داخلے کے بعد یاسر سے زیادہ ملنا جلنا ہوا تو یہ وابستگی، انسیت اور پھر لگاؤ میں بدلنا شروع ہوگئی۔ یاسر پیار سے مجھے ''ٹچ می ناٹ'' چھیڑتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ ''تم چھوئی موئی کا پھول ہو۔ یہ پھول تازگی چھیننے والی ہر چیز کا اثر فوراً قبول کرلیتا ہے۔''

میں مسکرا کر کہتی۔ ''تو تم تازگی چھیننے والی چیز نہ بننا۔''

''دل پر کسی کا بس تو نہیں ہوتا۔ کیا پتا، جو وعدہ میں آج کروں، کل اس پر قائم نہ رہ سکوں۔''

ایسی باتیں ہم ہنسی مذاق میں کیا کرتے تھے، میں اب اتنی نازک مزاج بھی نہیں رہی تھی جتنی بچپن میں تھی۔ نزلہ زکام بھی اب کافی وقفے کے بعد اثر انداز ہوتا تھا بلکہ اس حوالے سے میں تقریباً نارمل ہی ہوچکی تھی۔ عمومی صحت بھی اب پہلے سے کافی اچھی رہتی تھی۔

دھیرے دھیرے ہم دونوں کا تعلق ''محبت'' میں بدل گیا۔ امی کی اجازت سے میں کبھی کبھار یاسر کی بائیک پر بھی کالج سے واپس آجاتی۔ یاسر کا ہمارے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ وہ بہت خیال رکھنے والا اور ہمدرد انسان تھا۔ امی، میری اور اس کی انسیت سے آگاہ ہوچکی تھیں اور شاید ذہنی طور پر اس رشتے کے لیے تیار بھی تھیں لیکن وہ چاہتی تھیں کہ یاسر پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہو۔ یاسر کے والد فوت ہوچکے تھے اور یہ لوگ ابھی تک اندرون شہر سات آٹھ مرلے کے گھر میں رہتے تھے۔ یاسر سے بڑی دو بہنیں تھیں جن کی ابھی شادیاں ہونا باقی تھیں۔ یاسر اور اس کے گھر والوں کی گزر بسر تین دکانوں کے کرایے وغیرہ سے ہورہی تھی۔ میرے ابو اس رشتے پر زیادہ خوش نہیں تھے لیکن اتنی لچک انہوں نے اپنے اندر ضرور رکھی تھی کہ اگر یاسر کو اچھی جاب مل گئی اور اس نے اپنی مالی حالت بہتر کرلی تو وہ اس بارے میں غور کریں گے۔

انہی دنوں کی بات ہے ایک روز میں کالج سے گھر لوٹی تو مجھے ایک روح فرسا خبر ملی۔ یہ خبر ایک ایسی محبوب ہستی کے بارے میں تھی جس کو میں نے کچھ عرصے سے تقریباً فراموش کر رکھا تھا۔ مجھے گھر والوں کی زبانی پتا چلا کہ چچی سارہ اپنے گھر کے پاس ہی ایک ٹریفک حادثے میں شدید زخمی ہوگئی ہیں اور انہیں بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ ان کی حالت نازک ہے۔ ہم لوگ بھاگم بھاگ شہر کے دوسرے کنارے پر واقع اس اسپتال میں پہنچے۔ وہ اس وقت آپریشن تھیٹر میں تھیں۔ ان کے سر پر اور ریڑھ کی ہڈی میں شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ امید سے بھی تھیں۔ دو ڈھائی ماہ بعد بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ وہ گھر کی قریبی مارکیٹ سے سبزی لینے کے لیے پیدل ہی نکلی تھیں۔ ایک بغلی سڑک سے آنے والی تیز رفتار اسکول وین نے انہیں ٹکر ماری اور وہ دیوار سے ٹکرا کر بے ہوش ہوگئیں۔

وہ بڑی دلخراش شام تھی۔ سورج کے ساتھ ہی چچی سارہ کی زندگی کا سورج بھی ڈوب گیا۔ وہ آپریشن تھیٹر سے زندہ نہیں نکل پائیں۔ دو معصوم بچوں اور غمزدہ خاوند کو چھوڑ کر وہ قبرستان کی گہری تاریکیوں میں جالیٹیں۔

ان کی موت کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں ان سے

کتنا پیار کرتی تھی۔ میں کئی دن سکتے کی سی کیفیت میں رہی۔ میرے اندر جیسے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوستی بھی تھی کہ ایک عرصے تک ایک بے نام خوف کی وجہ سے میں کیوں ان سے دور دور رہی۔ پھر کبھی کبھی ایک بھولا بسرا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگتا۔ یہ فقرہ ایک مرتبہ بڑی چچی نبیلہ نے ایک زہریلی سرگوشی کی صورت میں بڑے چچا سے کہا تھا۔ وہ بولی تھیں۔ ''اسے الرجی ورجی نہیں ہے۔ بس ڈرامے کرتی ہے۔'' پھر شاید بڑی چچی نے یہ بھی کہا تھا۔ ''الرجی سے زیادہ خطرناک بیماری ہے اسے......''

الرجی سے زیادہ خطرناک؟ کیا چچی سارہ کسی اور خطرناک بیماری میں بھی مبتلا تھیں؟ کوئی ایسی تکلیف جسے ان کے میکے والوں نے چھپایا تھا اور پھر وہ بھی چھپاتی رہی تھیں۔ وہ کیا تکلیف ہوسکتی تھی۔ یہ سوال میرے لیے ایک پہیلی بن کر رہ گیا تھا۔

چچی سارہ کی موت کے غم نے کم وبیش تین ماہ تک مجھے گھیرے رکھا۔ پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ بڑے بڑے سنگین صدمے دھیرے دھیرے اپنی شدت کھونے لگتے ہیں۔ گردش روز و شب...... ہمہ وقت رستے زخموں کو خشک کرنے لگتی ہے۔ میں بھی پڑھائی کی مصروفیت میں اس قدر گم ہوئی کہ باقی سب کچھ بھول گئی۔ ایف ایس سی میں نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور پھر بی اے میں داخلہ لے لیا۔ یاسر کے ساتھ بھی تعلقات معمول پر تھے۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے تھے اور جب نہیں ملتے تھے، تب بھی ایک دوسرے کے خیالوں میں گم رہتے تھے۔ سردیوں کی طویل راتیں، گرمیوں کی حسین شامیں، ساون کی خوب صورت جھڑیاں اور بہار کی چھکیلی خوشبودار صبحیں، ہماری محبت کی گواہ تھیں مگر پانچواں موسم غم کا بھی تو ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ یہ موسم خزاں میں ہی آئے۔ یہ موسم کسی بھی موسم میں انسان کو دبوچ سکتا ہے۔ مجھے اور یاسر کو اس موسم نے سردیوں کی نہایت خنک شاموں میں دبوچا۔ یاسر کی والدہ پر فالج کا حملہ ہوا اور ان کا ایک بازو اور ٹانگ بے کار ہوگئی۔ انہیں اسپتال میں داخل کرایا گیا اور علاج پر اندھا دھند روپیہ خرچ ہونے لگا۔ یاسر کا سیکنڈ لاسٹ سمسٹر بھی بیچ میں ہی رہ گیا۔ پانچ چھ ہفتوں کے اندر اندر ان لوگوں کو اپنی ایک دکان اونے پونے بیچنا پڑی۔ یاسر کی بڑی بہن کی شادی کی تیاری تھی، وہ تیاری بھی درمیان میں ہی اٹک گئی۔ لڑکے والوں کو تاریخ دی جاچکی تھی۔ یاسر نے جیسے تیسے بہن کی ڈولی تو رخصت کردی لیکن اس کے لیے اسے اپنی دوسری دکان بھی فروخت کرنا

پڑی۔ والدہ کی بیماری نے مسلسل اخراجات کا راستہ کھول رکھا تھا۔ آمدن نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک روز گھر میں میرے ابو اور امی کے درمیان تند و تیز باتیں ہوئیں۔ ان باتوں کی بازگشت میرے کانوں تک بھی پہنچی۔ مجھے پتا چلا کہ ابو نے امی کو سختی سے کہہ دیا ہے کہ یاسر ہمارے گھر میں زیادہ آمدورفت نہ رکھے۔

میں آنسوؤں کے گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ حالات مسلسل ہمیں ایک دوسرے سے دور لے جا رہے تھے۔ انہی دنوں پتا چلا کہ یاسر نے فی الحال اپنی پڑھائی کو مؤخر کر دیا ہے اور اپنی آخری دکان کو اپنے استعمال میں لے آیا ہے۔ اس نے وہاں کمپیوٹر ہارڈویئر کی فروخت کا کام کر لیا تھا۔ انہی دنوں میرے ابو اور یاسر کے ایک تایا کے درمیان لین دین کے تنازعے پر تلخ ترش باتیں بھی ہو گئیں۔ اس واقعے کے بعد میرے اور یاسر کے رشتے کی امید تقریباً ختم ہو گئی۔ ابو میرے ہونے والے شوہر کو کسی اچھے سرکاری یا نیم سرکاری عہدے پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ یاسر اور اس کے گھر والوں سے خوش نہیں تھے۔

قریباً ایک سال تک یہی دھوپ چھاؤں والی صورتِ حال چلتی رہی...... پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ جونہی میرا بی اے مکمل ہوا، ابو امی نے میری منگنی غیروں میں کر دی۔ لڑکے کا نام توفیق عمر تھا۔ اچھی ملازمت تنخواہ و مراعات تھیں۔ ترقی کے امکانات بھی روشن تھے۔ ان تمام تر ''روشن امکانات'' کے باوجود میری آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سینے میں ہر وقت جیسے آنسوؤں کا ایک آبشار سا گرتا رہتا تھا لیکن یہ آبشار دل میں سلگتے ہوئے انگاروں کو ٹھنڈا نہیں کرتا تھا، مزید بھڑکاتا تھا۔ انہونیوں کی امید انسان کے دل میں ہمیشہ رہتی ہے۔ میں بھی اپنے دل میں یہ امید پالتی تھی کہ پانچ چھ ماہ ابھی باقی ہیں۔ ان پانچ چھ ماہ میں ہی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اور میں اپنی محبت کے اس دردناک انجام سے بچ جاؤں گی...... لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ جذبوں کی موت اور سمجھوتوں میں لپٹی ہوئی ایک نئی زندگی کی شروعات...... توفیق سے میری شادی ہو گئی اور میں دلہن بن کر لاہور سے ملتان چلی گئی۔

زخم اتنی جلدی نہیں بھرتے۔ اس کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ میں بھی اپنے نئے گھر میں اس وقت کا انتظار کرنے لگی۔ میری تین نندیں تھیں، ایک دیور بھی تھا۔ میں خود کو سارا دن ان لوگوں کے ساتھ مصروف رکھتی۔ توفیق آتے تو زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارتی۔ خود کو توفیق کی گرم جوشی میں گم کرنے کی کوشش کرتی۔ ان کی باہوں کی حرارت میں اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔ میں سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی لیکن جتنی شدت سے بھول جانا چاہتی، اتنی ہی شدت سے وہ یاد بھی آ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، چھوٹی چھوٹی یادیں۔ شادی سے چند روز پہلے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیا تھا لیکن خدا حافظ کہہ دینے اور الوداع کر دینے سے تو کوئی دور نہیں چلا جاتا۔ جیسے شہر بستے بستے، بستے ہیں، اسی طرح یادوں کے نگر بھی خالی ہوتے ہوتے خالی ہوتے ہیں۔

برسات کی ایک اداس شام میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اچانک توفیق کی کار کا ہارن سنائی دیا۔ میں بھونچکی رہ گئی۔ وہ دو ڈھائی گھنٹے پہلے ہی دفتر سے واپس آ گئے تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ دو تین دفعہ مجھے روتے ہوئے پکڑ چکے تھے۔ میں نے امی ابو کی یاد کا بہانہ بنایا تھا اور انہوں نے مجھے سختی کے ساتھ، رونے دھونے سے منع کیا تھا۔ آج پھر یہی صورتِ حال بن رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا۔ قریب ہی ایک باسکٹ میں پیاز پڑے تھے۔ چھری بھی تھی۔ میں نے باسکٹ اپنی طرف کھسکائی اور جلدی جلدی پیاز کاٹنے میں مصروف ہو گئی۔ یہ تدبیر کارگر رہی۔ کچھ دیر بعد جب توفیق کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں میرے رونے کا بالکل علم نہیں ہوا۔ صرف اتنا ہی بولے۔ ''بھئی! پیاز کاٹتے وقت اسے پانی میں بھگوتے جائیں تو جلن کم ہو جاتی ہے۔''

کتنی مشکل صورتِ حال کا یہ کتنا آسان حل نکلا تھا۔ مجھے کہیں پڑھا ہوا ایک دل گداز مضمون یاد آ گیا۔ مضمون کا عنوان تھا لڑکیاں پیاز کیوں کاٹتی ہیں۔ بہرحال میں نے آنسوؤں اور پیاز کے اس معنی خیز تعلق کو اپنے پلے سے باندھ لیا۔

اگلے تین ماہ میں کم از کم دو دفعہ ایسا ہوا کہ اس پیاز کی وجہ سے ہی میں توفیق کے سامنے اپنے ''اشک بار'' دکھ کو چھپانے میں کامیاب رہی۔ عام طور پر میں توفیق کے آنے سے کافی پہلے ہی اپنے آپ کو سنبھال لیتی تھی اور اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاتی تھی۔ انہی دنوں مجھے پہلی دفعہ ''رونے دھونے'' کا اصل مفہوم بھی سمجھ میں آیا تھا۔ رونے کے ساتھ دھونا شاید اسی لیے لازم ملزوم ٹھہرتا ہے۔ دھیرے دھیرے دل کو کچھ قرار آتا جا رہا تھا...... یادیں تو اپنی جگہ موجود تھیں لیکن شاید اب بتدریج وہ گہرائی میں جا رہی تھیں۔ زندہ رہنے کے لیے اور آگے بڑھنے کے لیے تلخ یادوں کا

گہرائی میں جانا ضروری ہوتا ہے۔ شاید اسی طرح قدرت جذبات کے سرچشموں کے لیے نئے راستے پیدا کرتی ہے۔ ہدایات کے مطابق یاسر نے بھی اب خود کو آہستہ آہستہ سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ ایک روز ایک بار پھر میں بری طرح پھنس گئی۔ اس روز لاہور سے بڑے بھائی جان کا فون آیا تھا۔ ان کی زبانی پتا چلا تھا کہ یاسر کی شادی ہوگئی ہے۔ اپنی معاشی مجبوریوں کے سبب وہ خاندان کے ہی ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی سے شادی پر رضامند ہوگیا تھا۔ لڑکی شکل وصورت کے لحاظ سے ہرگز اس کی ہم پلہ نہیں تھی۔ عمر میں بھی شاید ایک آدھ سال اس سے بڑی ہی تھی۔ اس رشتے کی بات چیت اور تیاری کئی دنوں سے ہو رہی تھی۔ آخرکل سب کچھ انجام پا گیا تھا۔

اس دن میں ایک بار پھر دیر تک روتی رہی اور اس دن ایک بار پھر غیر متوقع طور پر توفیق گھر آگئے تھے۔ کسی اسٹرائیک کی وجہ سے وہ آفس جا ہی نہیں سکے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس حالت میں ان کے سامنے گئی تو بہت بری طرح ڈانٹ کھاؤں گی بلکہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ خدانخواستہ...... وہ کسی شک میں مبتلا ہو جاتے۔ میں اپنی ورم زدہ آنکھوں کے ساتھ تیزی سے کچن کی طرف لپکی۔ پیاز اور چھری...... یہ دو چیزیں...... یہ دو غیر اہم چیزیں اس صورتِ حال میں میرا واحد سہارا تھیں۔ کچن میں پہنچ کر میں چکرا کر رہ گئی۔ یہ ایک سنگین اتفاق تھا کہ مجھے کہیں پیاز نظر نہیں آئی۔ میں نے دیوانوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ چلائے، ملازمہ کو آوازیں دیں۔ اسی دوران میں توفیق کامن روم میں آچکے تھے۔ ”نادو...... نادو۔“ انہوں نے مجھے پکارا۔

میرا دل سینے میں بے طرح دھڑک رہا تھا۔ میں جیسے، ایک چور تھی اور رنگے ہاتھوں پکڑی جانے والی تھی۔

وہ اب کچن کی طرف ہی آرہے تھے۔ میں نے ٹشو پیپر پکڑا اور افراتفری میں اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔ وہ اندر آگئے، مجھے غور سے دیکھا۔

”کیا ہوا ہے نادیہ؟“ انہوں نے پوچھا۔

”پپ...... پتا نہیں...... الرجی...... شش شاید...... الرجی ہوگئی ہے۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”اوہ۔ ایک تو تم لڑکیوں کو نخرے دکھانے کا شوق ہوتا ہے۔ رات کو کہا بھی تھا کہ سویٹر پہن کر نکلو۔“ انہوں نے کہا اور کمرے کی طرف چلے گئے۔

میرے کانوں میں اپنے ہی الفاظ گونج رہے تھے اور دل ودماغ میں زلزلہ پیدا کر رہے تھے...... الرجی...... شاید الرجی ہوگئی ہے۔

ان چار پانچ الفاظ نے میرے سامنے سے جیسے ایک دبیز پردہ اٹھا دیا۔ مجھے اچانک ہی اپنے ایک دیرینہ سوال کا جواب مل گیا تھا۔

چچی سارہ کو بھی تو الرجی تھی۔ گھر میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں الرجی نہیں ہے۔ بڑی چچی نبیلہ کا وہ فقرہ ابھی تک میری سماعت میں محفوظ تھا۔ ”اسے الرجی ورجی کچھ نہیں، بس ڈرامے کرتی ہے۔“ اور انہوں نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ اسے الرجی سے زیادہ خطرناک بیماری ہے۔

اب مجھے اس خطرناک بیماری کی سمجھ اچھی طرح آرہی تھی۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ آپ ہر دفعہ اپنے آنسو...... پیاز کے پیچھے چھپا سکیں یا پھر آنکھوں میں دھواں یا تنکا وغیرہ پڑنے کا بہانہ کر سکیں۔ آپ کو اپنے آنسوؤں کی پردہ داری کا ”مستقل انتظام“ چاہیے ہوتا ہے...... اور کبھی کبھی کسی کے ذہن رسا میں اس طرح کا ”انتظام“ بھی آجاتا ہے۔ چچی سارہ کے ذہن میں بھی ایسا ہی جدا انتظام آیا تھا۔

اب سب کچھ میری سمجھ میں آرہا تھا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت جب توفیق دفتر گئے ہوئے تھے اور باقی گھر والے بھی اپنی اپنی مصروفیات میں گم تھے، میں کمرا بند کر کے دیر تک بیٹھی رہی۔ چچی سارہ کی ایک تصویر میرے سامنے تھی۔ وہ کسی شاعر کی خوب صورت غزل لگتی تھیں۔ پتا نہیں کون شاعر تھا؟ لیکن غزل تو میرے سامنے تھی۔ لمبے بال کندھوں پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ خوب صورت آنکھوں میں کسی خاموش محبت کی جوت تھی...... آہ عورت کی مجبوریاں۔

میں نے محویت کے عالم میں تصویر کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوا اور نمناک لہجے میں کہا۔ ”چچی...... آج میں جان گئی ہوں۔ آپ کو الرجی نہیں تھی...... آپ کو محبت تھی۔ کوئی نہ کوئی یاسر آپ کی زندگی میں بھی آیا تھا۔ کسی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آپ نے بھی سنہری سپنے دیکھے تھے۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے چچی۔ بند ہونٹوں کے ساتھ صبر کا دامن تھامے رکھنا اور اپنے اندرونی کرب کو چہرے پر نہ آنے دینا مجھے آپ سے ہی تعلیم ہوا ہے۔ میں بھی آپ ہی کے نقشِ قدم پر چلوں گی۔ اپنی ازدواجی زندگی کو اپنے ماضی کے سایوں سے حتی الامکان دور رکھوں گی۔ اگر کبھی کبھار دل پر غم کے بادل چھائے بھی تو مجھے رونا نہیں آئے گا...... بس الرجی ہوگی۔“